© NCERT not to be republished

اس باب میں...

پچھلے باب میں قومی تعمیر کے چیلنج کو، جمہوری سیاست کو قائم کرنے کے چیلنج کے ساتھ بیان کیا گیا تھا۔ اسی طرح سیاسی پارٹیوں کے درمیان انتخابی مقابلے آزادی کے فوراً بعد ہی شروع ہوگئے۔ اس باب میں ہم انتخابی سیاست کی پہلی دہائی پر بحث کریں گے تاکہ ہم درج ذیل باتوں کو سمجھ سکیں:

- آزاد اور منصفانہ الیکشن کے نظام کا قیام؛
- آزادی کے فوراً بعد کے سالوں میں کانگریس پارٹی کا غلبہ؛ اور
- مخالف پارٹیوں کا ظہور اور ان کی پالیسیاں۔

مندرجہ بالا مشہور اسکیچ شنکر کے کارٹونوں کے مجموعہ Don't Spare Me, Shanker کے سرورق پر آیا تھا۔ اصل کارٹون چین کے بارے میں ہندوستان کی پالیسی کے پس منظر میں بنایا گیا تھا۔ لیکن کارٹون حقیقت میں کانگریس کے غلبہ والے زمانے میں اسی کے دوہرے کردار کو ظاہر کرتا ہے۔

باب 2

ایک پارٹی کی بالادستی کا زمانہ

5281CH02

جمہوریت کی تعمیر کا چیلنج

اب آپ کو ان مشکل حالات کا اندازہ ہو گیا ہو گا جن میں آزاد ہندوستان کا ظہور ہوا۔ ابتدا میں قومی تعمیر کے سلسلے میں جن سنگین مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان کے بارے میں بھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ دنیا کے دوسرے ممالک میں ایسے ہی مسائل سے الجھے ہوئے رہنماؤں نے تو یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جمہوریت کو اختیار نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا تھا کہ قومی اتحاد ان کی پہلی ترجیح ہے اور جمہوریت کا مطلب اختلافات اور تنازعات کو جگہ دینا ہے۔ اس لیے ایسے بہت سے ممالک جو نو آبادیاتی تسلط سے آزاد ہوئے انھوں نے غیر جمہوری طرز حکومت اختیار کر لیا۔ اس طرز حکومت کی کئی شکلیں تھیں۔ جیسے کہ صرف نام نہاد جمہوریت لیکن حقیقت میں ایک لیڈر کی مضبوط گرفت، ایک پارٹی کی حکومت یا براہ راست فوجی حکومت۔ تمام غیر جمہوری حکومتوں کی ابتدا اس وعدے سے ہوئی کہ وہ جلد ہی جمہوری نظام کو نافذ کریں گی لیکن ایک بار اقتدار میں آنے کے بعد ان کو ہٹانا بہت مشکل تھا۔

اگرچہ ہندوستان میں بھی حالات کچھ مختلف نہیں تھے لیکن نئے آزاد شدہ ہندوستان کے رہنماؤں نے مشکل راستے کو چنا۔ کیوں کہ ہماری جدوجہد آزادی جمہوریت کے نظریے سے جڑی ہوئی تھی۔ اس لیے کسی اور راستے کا انتخاب حیران کن ہوتا۔ ہمارے لیڈروں کو کسی بھی جمہوریت میں سیاست کے اہم اور نازک کردار کا احساس تھا۔ انھوں نے سیاست کو مسئلہ نہیں بلکہ مسائل کو سلجھانے کا ایک طریقہ سمجھا۔ ہر سماج کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی طرزِ حکومت کے بارے میں فیصلہ کرے۔ انتخاب کرنے کے لیے متبادل ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ مختلف گروہ مختلف اور متضاد امنگیں اور حوصلے رکھتے ہیں۔ ہم ان اختلافات کو کیسے دور کر سکتے ہیں؟۔ اس سوال کا جواب جمہوری سیاست ہے۔ اگرچہ زور آزمائی اور طاقت بہ ظاہر سیاست کی دو نمایاں خصوصیات ہیں لیکن دراصل مفاد عامّہ کا حصول سیاسی سرگرمیوں کا اصل مقصد ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ ہمارے رہنماؤں نے اسی راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا۔

پچھلے سال آپ نے پڑھا تھا کہ ہمارا دستور کس طرح تحریر کیا گیا تھا۔ آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ دستور کی تیاری کے بعد 26 نومبر 1949 کو اسے اختیار کیا گیا 24 جنوری 1950 کو اس پر دستخط کیا گیا اور 26 جنوری 1950 کو اس کا نفاذ عمل میں آیا۔

"ہندوستان میں ......
ہیرو یعنی بڑی اور نمایاں شخصیات
کی پرستش اور ان سے عقیدت
سیاست میں جو کردار ادا کرتی
ہے اس کی نظیر دنیا کے کسی
دوسرے ملک میں نہیں ملتی ......
لیکن سیاست میں ہیرو کی
پوجا اور عقیدت مندی انحصار
کی جانب ایک یقینی راستہ ہے
جو بالآخر مطلق العنانی یعنی
ڈکٹیٹرشپ پر ختم ہوتا ہے۔"

باباصاحب ڈاکٹر بی آر امبیڈکر
قانون ساز اسمبلی میں تقریر
25 نومبر 1949

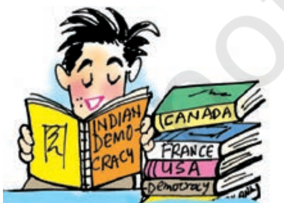

ہمارے جمہوری ہونے میں کیا خاص بات ہے؟ آخر کار جلدی یا دیر سے دنیا کا ہر ملک جمہوری بن گیا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟

© NCERT not to be republished

عارضی حکومت کی نگرانی میں تھا۔ اس لیے اب یہ لازم تھا کہ ملک میں جمہوری طرز پر منتخب حکومت قائم کی جائے۔ دستور نے اصول وضع کر دیے تھے بس اب مشینری کو حرکت میں لانا تھا۔ شروع میں یہ سمجھا گیا تھا کہ یہ چند مہینوں کا کام ہے۔ جنوری 1950 میں الیکشن کمیشن کا قیام عمل میں آیا اور سوکمار سین ہندوستان کے پہلے چیف الیکشن کمشنر بنے۔ ہندوستان کے پہلے عام انتخابات 1950 کے اندر ہی اندر متوقع تھے۔

لیکن الیکشن کمیشن نے بخوبی سمجھ لیا کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں آزاد اور صاف ستھرا الیکشن کرانا آسان کام نہیں ہے۔ الیکشن کا مطلب تھا کہ پہلے انتخابی حلقوں کی حد بندی کی جائے پھر ووٹروں کی فہرست بنے یا ان تمام شہریوں کے ناموں کی فہرست تیار کی جائے جو ووٹ ڈالنے کا حق رکھتے ہوں۔ ان کاموں میں بہت وقت لگا۔ جب پہلا مسودہ تیار ہو کر آیا تو معلوم ہوا کہ فہرست میں تقریباً چالیس لاکھ عورتوں کے نام نہیں لکھے گئے ہیں اور 'فلاں کی بیوی' یا 'فلاں کی بیٹی' لکھا گیا ہے۔ الیکشن کمیشن نے اس فہرست کو نامنظور کر دیا اور نظر ثانی کا حکم دیا بلکہ ضرورت پڑنے پر مسترد کرنے کا بھی۔ پہلے الیکشن کی تیاری ایک عظیم کام تھا۔ دنیا میں اس سے پہلے اس پیمانے پر الیکشن نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت تقریباً سترہ کروڑ ووٹر تھے جن کو تین ہزار دو سو قانون ساز اسمبلیوں کے اراکین (MLA) اور چار سو نواسی لوک سبھا کے ممبروں کو منتخب کرنا تھا۔ ان اہل سترہ کروڑ ووٹروں میں صرف پندرہ فی صد پڑھے لکھے تھے۔ لہٰذا الیکشن کو کسی خاص انداز کی ووٹنگ کے طریقۂ کار کے متعلق سوچنا تھا۔ الیکشن کمیشن نے تقریباً تین لاکھ اسٹاف کو الیکشن کرانے کی تربیت دی۔

اس کارٹون میں کانگریس کی اُس الیکشن کمیٹی کے بارے میں ایک تاثر ہے جو 1951 میں پارٹی امیدواروں کو چننے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کارٹون میں نہرو کے ساتھ ساتھ مرار جی ڈیسائی، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے، کامراج ناڈر، راج گوپال آچاریہ، جگ جیون رام، مولانا آزاد، ڈی۔ پی مشرا، پی۔ ڈی۔ ٹنڈن اور گووند بلبھ پنت کو دیکھا جاسکتا ہے۔

© NCERT not to be republished

رائے دہندگی کے بدلتے طریقے

تیسری سے لے کر تیرھویں لوک سبھا تک عام الیکشن کے لیے استعمال ہونے والے بیلٹ پیپر کا ایک نمونہ

آج کل ہم رائے دہندوں کی ترجیحات کو ریکارڈ کرنے کے لیے الیکٹرونک ووٹنگ مشین (EVM) کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے شروعات اس طرح نہیں کی تھی۔ پہلے عام الیکشن میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر پولنگ بوتھ میں ہر امیدوار کے لیے ایک ایک صندوق رکھا جائے جس پر امیدوار کا چناؤ نشان موجود ہو۔ ہر ووٹر کو ایک خالی بیلیٹ پیپر دیا جائے گا جس کو وہ اس امیدوار کے صندوق میں ڈالے گا جس کو وہ ووٹ دینا چاہتا ہے۔ تقریباً بیس لاکھ اسٹیل کے صندوقوں کا استعمال اس مقصد کے لیے ہوا تھا۔ پنجاب کے ایک پریزائیڈنگ آفیسر نے ان صندوقوں کی تیاری سے متعلق اپنا تجربہ بیان کیا ہے۔ ''ہر صندوق میں امیدوار کا نشان اندر اور باہر چاروں طرف' اس کے نام کے ساتھ، جو اردو، ہندی اور پنجابی میں لکھا ہو، ظاہر ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ چناؤ کے حلقہ، پولنگ اسٹیشن اور پولنگ بوتھ کا نمبر بھی ہونا چاہیے۔ کاغذ کی مہر کو امیدوار کے نمبر شمار کے ساتھ جس پر پریزائیڈنگ افسر کے دستخط ہوں، نشان کے فریم میں داخل کرنا ضروری تھا اور اس کی کھڑکی کو اس کے دروازے سے بند کرنا تھا اور جسے اس کے دوسرے سرے پر تار سے باندھنا تھا۔ یہ سب کچھ چناؤ کی پولنگ سے ایک دن پہلے ہونا تھا۔ چناؤ کے نشانوں اور لیبل کو چپکانے کے لیے پہلے صندوق کو ریگ مال یا پتھر کے ٹکڑے سے رگڑنا پڑتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کام میں چھ لوگوں کو، جن میں میری دو بیٹیاں بھی شامل ہیں، پانچ گھنٹے کا وقت لگا۔ یہ سب کام میرے گھر ہی میں ہوا۔''

الیکٹرانک ووٹنگ مشین

پہلے دو انتخابات کے بعد یہ طریقہ بدل دیا گیا۔ اب چناؤ کاغذ پر تمام امیدواروں کے نام اور ان کے چناؤ نشان ہوتے تھے۔ رائے دہندگان کو اپنی پسند کے امیدوار کے نام پر مہر لگانی ہوتی تھی۔ اس طریقہ کار پر تقریباً چالیس سال تک عمل ہوتا رہا۔ 1990 کے آخر سے الیکشن کمیشن نے EVM کا استعمال شروع کیا اور 2004 سے کئی ممالک EVM کی طرف منتقل ہو گئے۔

آیئے تحقیق کریں

اپنے گھر اور پڑوس کے بزرگوں سے ان کے الیکشن میں حصہ لینے کے تجربہ کے بارے میں سوال کریں۔

- کیا ان میں سے کسی نے پہلے اور دوسرے عام الیکشن میں حصہ لیا تھا؟ اس نے کس کو اور کیوں ووٹ دیا تھا؟
- کیا کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے ووٹنگ کے تینوں طریقہ کار کا استعمال کیا ہو؟۔ ان میں سے اس کو کون سا طریقہ زیادہ پسند آیا تھا؟
- کن اسباب کی بنا پر وہ پہلے کے الیکشن کو آج کے الیکشن سے مختلف پاتے ہیں؟

© NCERT not to be republished

اس الیکشن کو غیر معمولی بنانے میں صرف رقبہ اور ووٹروں کی تعداد کا ہی ہاتھ نہیں تھا۔ پہلا عام الیکشن ایک غریب اور ان پڑھ ملک میں جمہوریت کی پہلی آزمائش بھی تھا۔ اب تک جمہوریت صرف دولت مند ملکوں ہی میں پنپ سکی تھی خاص طور سے یوروپ اور امریکہ میں جہاں تقریباً ہر آدمی پڑھا لکھا تھا۔ اس وقت تک یوروپ کے کئی ملکوں میں عورتوں کو حق رائے دہندگی نہیں ملا تھا۔ اس حوالے سے ہندوستان کا عام حق رائے دہندگی کا فیصلہ ایک جرأت مندانہ اور جوکھم بھرا اقدام تھا۔ ایک ہندوستانی ایڈیٹر نے اس کو 'تاریخ کا سب سے بڑا جوا' قرار دیا۔ ایک اور میگزین 'آرگنائزر' نے لکھا کہ جواہر لعل نہرو کو ''اپنی زندگی ہی میں عام رائے دہندگی کے حق کی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑے گا''۔ انڈین سول سروس کے ایک برطانوی ممبر کا خیال تھا کہ 'ایک آنے والا اور زیادہ روشن خیال زمانہ' لاکھوں ناخواندہ عوام کے ووٹ کی ریکارڈنگ کے مضحکہ خیز ڈھونگ کو حیرت اور استعجاب کی نظر سے دیکھے گا۔

انتخابات کو دوبارہ ملتوی کرنا پڑا۔ آخر کار اکتوبر 1951 سے فروری 1952 تک الیکشن ہوئے۔ لیکن اس الیکشن کو 1952 الیکشن کے نام سے جانا جاتا ہے کیوں کہ ملک کے اکثر حصّے میں ووٹنگ جنوری 1952 میں ہوئی۔ انتخابی مہم' ووٹنگ اور ووٹ شمار کرنے میں چھ مہینے صرف ہوئے۔ الیکشن میں مقابلے کا پہلو بھاری تھا اور ایک سیٹ کے لیے اوسطاً چار سے زیادہ امیدواروں میں مقابلہ ہوا۔ حصّے داری کا عنصر بھی حوصلہ افزا تھا۔ جب نتیجے سامنے آئے تو شکست خوردہ امیدواروں تک نے اس کو منصفانہ تسلیم کیا۔ ہندوستانی تجربہ نے نکتہ چینوں کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ ٹائمز آف انڈیا کے خیال میں انتخابات نے ان تمام شکّی لوگوں کو حیرانی میں ڈال دیا ہے جن کے خیال میں ہندوستانیوں نے دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑے جمہوری انتخاب کے تجربے کی کامیابی میں قابلِ تعریف بندوبست کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستان سے باہر کے مبصرین بھی اسی طرح سے متاثر تھے۔ ہندوستان کا 1952 کا الیکشن ساری دنیا میں جمہوریت کا سنگِ میل بن گیا۔ اب اس بحث کی ضرورت نہیں رہی کہ پس ماندگی اور کم تعلیم کے ماحول میں جمہوری الیکشن نہیں ہو سکتے۔ اس الیکشن نے ثابت کر دیا کہ دنیا میں جمہوریت کہیں بھی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958) :
اصل نام – ابوالکلام محی الدین احمد اسلامیات کے عالم، مجاہد آزادی اور کانگریس کے رہنما، ہندو مسلم اتحاد کے حامی، بٹوارے کے مخالف، دستور ساز اسمبلی کے رکن اور آزاد ہندوستان کی پہلی کابینہ میں وزیرِ تعلیم۔

پہلے تین عام انتخابات میں کانگریس کی بالا دستی

پہلے عام الیکشن کے نتائج نے کسی کو حیران نہیں کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی کامیابی متوقع تھی۔ کانگریس پارٹی جو عام طور پر انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے جانی جاتی تھی، جدو جہد آزادی کی وارث تھی۔ اس وقت یہ واحد پارٹی تھی جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ پارٹی میں جواہر لعل نہرو تھے جو اس وقت ہندوستانی سیاست کے مقبول ترین اور پُر کشش رہنما تھے۔ انھوں نے کانگریس کی مہم کی سربراہی کی اور پورے ملک کا دورہ کیا۔ نتائج کے آنے پر کانگریس کی کامیابی کے وسیع پیمانے نے اکثر لوگوں کو حیران کر دیا۔ پہلی لوک سبھا کی 489 سیٹوں میں سے پارٹی

© NCERT not to be republished

کانگریس کی بالادستی

1952-1967

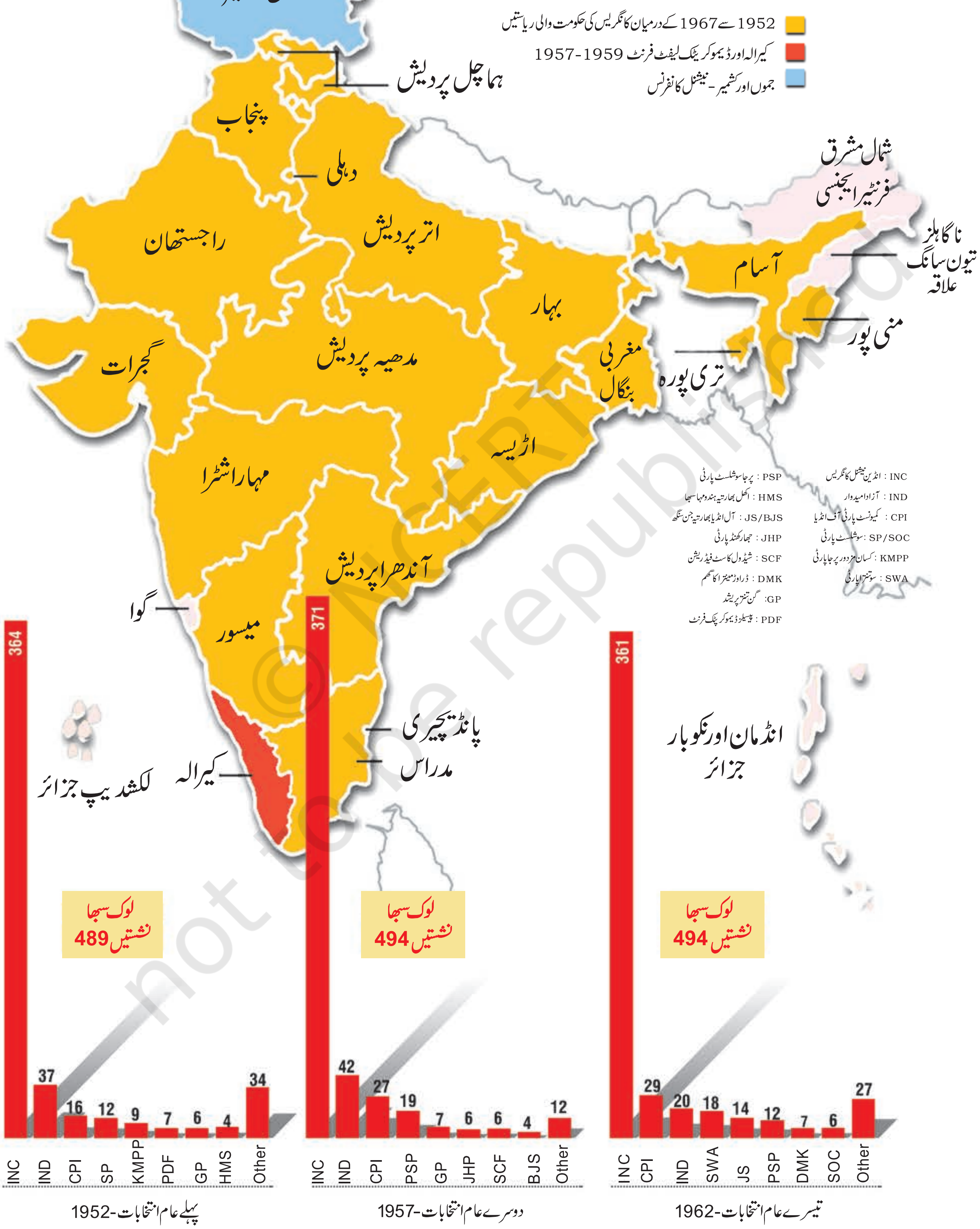

نوٹ : یہ نقشہ پیمائش کے مطابق نہیں بنایا گیا ہے، اسے ہندستان کی بیرونی سرحدوں کی مستند خاکہ کشی نہ سمجھا جائے۔

نے 364 سیٹوں پر کامیابی حاصل کی اور اپنی مخالف پارٹیوں سے کہیں آگے نکل گئی۔ جیتی ہوئی سیٹوں کے لحاظ سے دوسری بڑی پارٹی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ جس کے حصّے میں 16 سیٹیں آئی تھیں۔ ریاستوں کے الیکشن بھی لوک سبھا کے ساتھ ساتھ ہی ہوئے تھے۔ ان میں بھی کانگریس کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے ٹراونکور۔ کوچین (اب کیرالا کی ریاست میں) مدراس اور اڑیسہ کے سوا ہر جگہ اکثریت حاصل کی۔ بعد میں ان ریاستوں میں بھی کانگریس کی حکومت بن گئی۔ کانگریس پارٹی ملکی اور ریاستی سطح پر حکمراں ہوگئی اور جیسا کہ امید تھی پہلے عام الیکشن کے بعد جواہر لعل نہرو وزیر اعظم بنے۔

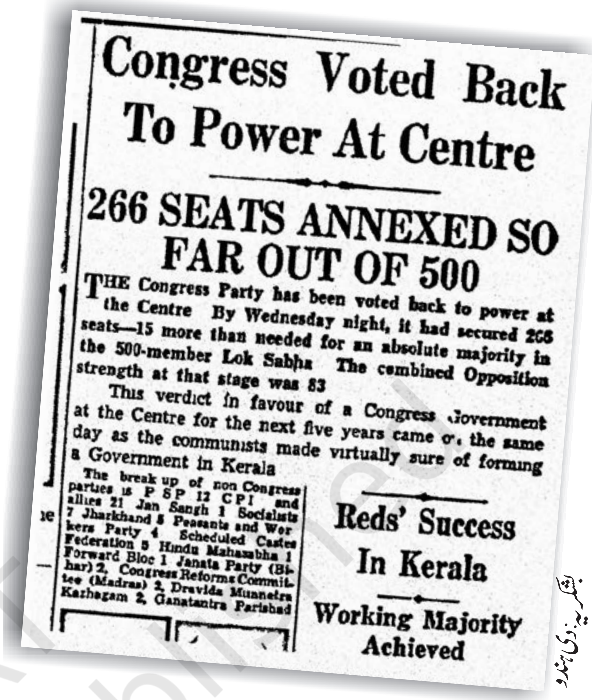
Congress Voted Back To Power At Centre

266 SEATS ANNEXED SO FAR OUT OF 500

THE Congress Party has been voted back to power at the Centre By Wednesday night, it had secured 265 seats—15 more than needed for an absolute majority in the 500-member Lok Sabha The combined Opposition strength at that stage was 83

This verdict in favour of a Congress Government at the Centre for the next five years came on the same day as the communists made virtually sure of forming a Government in Kerala

The break up of non Congress parties is P S P 12 C P I and allies 21 Jan Sangh 1 Socialists 7 Jharkhand 5 Peasants and Workers Party 4 Scheduled Castes Federation 5 Hindu Mahasabha 1 Forward Bloc 1 Janata Party (Bihar) 2, Congress Reforms Committee (Madras) 2, Dravida Munnetra Kazhagam 2, Ganatantra Parishad

Reds' Success In Kerala

Working Majority Achieved

بشکریہ: دی ہندو

پچھلے صفحہ پر دیئے گئے انتخابی نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے 1952 سے 1962 تک کے عرصے میں کانگریس کی بالادستی واضح ہوجائے گی۔ دوسرے اور تیسرے عام الیکشن میں، جو بالترتیب 1957 اور 1962 میں ہوئے، کانگریس نے لوک سبھا کی تین چوتھائی نشستیں حاصل کرکے اپنی بالادستی قائم رکھی۔ کوئی بھی مخالف پارٹی کانگریس کی جیتی ہوئی سیٹوں کا دسواں حصہ بھی نہ حاصل کرپائی۔ ریاستی اسمبلیوں میں کچھ جگہوں پر کانگریس اکثریت حاصل نہیں کرپائی جن میں سب سے اہم 1957 میں کیرالا کا معاملہ تھا جہاں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) کی سربراہی میں ایک مخلوط حکومت قائم ہوئی۔ اس کے علاوہ ہر جگہ ملکی اور ریاستی سطح پر کانگریس ہی غالب رہی۔

راج کماری امرت کور

(1889-1964)

گاندھیائی نظریہ کی حامل اور مجاہد آزادی، کپورتھلہ کے شاہی خاندان سے تعلق، ماں کی جانب سے عیسائی، دستور ساز اسمبلی کی رکن، آزاد ہندوستان کی پہلی وزارت میں وزیرِ صحت؛ 1957 تک اس عہدے پر فائز رہیں۔

ہمارے انتخابی نظام نے کانگریس کی کامیابیوں کو مصنوعی طریقے سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ حالاں کہ کانگریس نے ہر چار سیٹوں میں سے تین سیٹوں پر کامیابی حاصل کی لیکن وہ ڈالے گئے ووٹوں کا آدھا حصہ بھی نہ لے سکی۔ مثال کے طور پر 1952 میں کانگریس نے 45 فی صد ووٹ حاصل کیے تھے لیکن اس کی سیٹوں کی تعداد 74 فی صد تھی۔ حاصل کردہ ووٹوں کے اعتبار سے پورے ملک میں سوشلسٹ پارٹی دوسرے نمبر پر تھی جس کو 10 فی صد سے زیادہ ووٹ ملے تھے لیکن وہ 3 فی صد سیٹ بھی حاصل نہیں کرسکی۔ یہ سب کیسے ہوا؟ اس کو سمجھنے کے لیے آپ کو پچھلے سال کی درسی کتاب میں 'دستور پر عمل' کے زیرِ عنوان بحث کو دہرانا پڑے گا۔

ہمارے ملک میں رائج انتخابی نظام کے تحت وہ پارٹی جو اور تمام پارٹیوں سے زیادہ ووٹ حاصل کرتی ہے، اپنے ووٹوں کے تناسب سے زیادہ نشستیں حاصل کرتی ہے۔ اسی طریقۂ کار نے کانگریس کے حق میں کام کیا۔ اگر ہم تمام غیر کانگریسی امیدواروں کے ووٹوں کو شمار کریں تو ان کا مجموعہ کانگریس کے امیدوار سے زیادہ ہوگا۔ لیکن غیر کانگریسی ووٹ حریف امیدواروں اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔ اس طرح کانگریس مخالف پارٹیوں سے آگے نکل گئی اور کامیاب ہوئی۔

THE HINDU

INDIA'S NATIONAL NEWSPAPER

MADRAS, FRIDAY, JULY 31, 1959.

PRESIDENT'S RULE IN KERALA

CABINET ADVISES ACTION UNDER ARTICLE 356

PROCLAMATION MAY BE ISSUED TO-DAY

(From Our Correspondent)

NEW DELHI, July 30.

INTERVENTION BY CENTRE

KERALA MINISTER'S REACTION

"TRAGIC DRAMA" NEARING END

ANOTHER MAJOR WAR UNLIKELY

KRUSHCHEV'S VIEW: "FOREIGN

दिनिया

पूर्वी पाकिस्तान के स्वशासन की मांग सिर्फ 'स्टण्ट'

केरल शासन द्वारा शीघ्र भूमि सुधार का वचन

नम्बूद्रीपाद मंत्रि-मण्डल ने शपथ ग्रहण की

प्रथम साम्यवादी मुख्य मन्त्री की व्यापक नीति घोषित

کیرالا میں کمیونسٹوں کی کامیابی

1957 کے شروع میں کانگریس کو کیرالا میں شکست کا تلخ ذائقہ چکھنا پڑا۔ مارچ 1957 میں کیرالا اسمبلی کے الیکشن میں کمیونسٹ پارٹی نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں۔ 126 سیٹوں میں سے کمیونسٹ پارٹی نے 60 سیٹیں جیتیں اور اس کو پانچ آزاد امیدواروں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ گورنر نے اسمبلی میں کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر، ای۔ ایم۔ ایس۔ نمبو دری پد کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ یہ دنیا میں پہلی بار ہوا کہ کمیونسٹ پارٹی جمہوری الیکشن کے ذریعے اقتدار میں آئی۔

ریاست میں اقتدار ہاتھ سے نکلنے کے بعد کانگریس پارٹی نے منتخب حکومت کے خلاف 'آزادی کی جدوجہد' شروع کردی۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ترقیاتی اور انقلابی پروگرام اور پالیسیوں کے بل پر اقتدار میں آئی تھی۔ کمیونسٹوں نے الزام لگایا کہ ان کے خلاف احتجاج مفاد پرستوں اور مذہبی تنظیموں نے منظّم کیا ہے۔ 1959 میں کانگریس کی مرکزی سرکار نے کیرالا کی کمیونسٹ حکومت کو آئین کی دفعہ 365 کے تحت برخاست کردیا۔ یہ ایک متنازع فیصلہ تھا اور اس کو عام طور پر آئینی ہنگامی اختیارات کا پہلا غلط استعمال مانا گیا۔

بشکریہ: دی ہندو

اگست 1959 میں اپنی وزارت برخاست ہونے کے بعد ای۔ ایم۔ ایس نمبو دری پد، ٹری ویندرم میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کے ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے۔

سوشلسٹ پارٹی

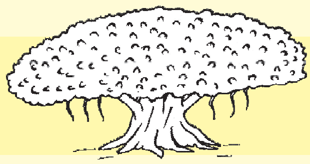

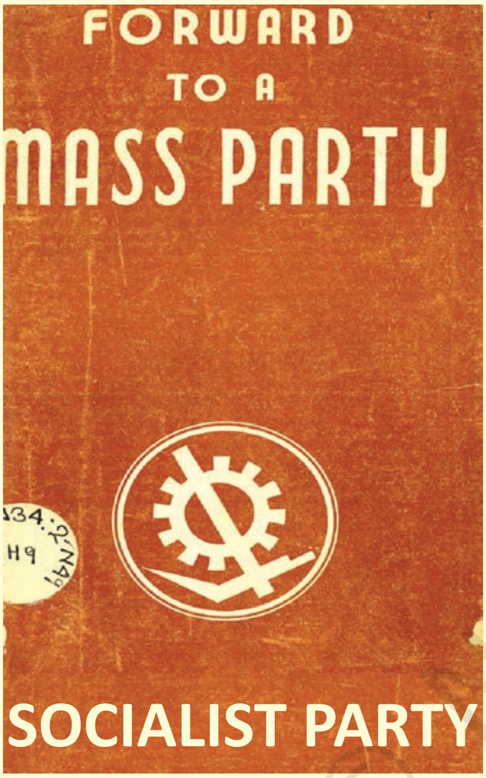

سوشلسٹ پارٹی کی جڑیں آزادی سے پہلے کے ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کی عوامی تحریکوں میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ 1934 میں کانگریس کے کچھ نوجوان لیڈروں نے جو کانگریس کو ایک زیادہ انقلابی اور سرگرم پارٹی دیکھنا چاہتے تھے کانگریس ہی کے اندر کانگریس سوشلسٹ پارٹی (CSP) کی بنیاد رکھی۔ 1948 میں کانگریس نے اپنے دستور میں ترمیم کی تاکہ اس کے ممبر دوسری پارٹیوں کی دوہری ممبرشپ میں نہ ملوث ہوں۔ الیکشن میں پارٹی کی کارکردگی سے اس کے حمایتیوں کو سخت دھچکا لگا۔ حالاں کہ اس کی شاخیں ہندوستان کی ہر ریاست میں موجود تھیں لیکن اس کو چند چھوٹے چھوٹے مقامات ہی میں انتخابی کامیابی ملی۔

سوشلسٹ لوگ جمہوری سوشلزم کے نظریے پر یقین رکھتے تھے جو ان کو کانگریس اور کمیونسٹوں، دونوں سے ممتاز کرتا تھا۔ وہ کانگریس پر نکتہ چینی کرتے تھے کہ وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ساتھ دیتی ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کو نظرانداز کرتی ہے۔ لیکن سوشلسٹ اس وقت تذبذب میں پڑ گئے جب 1955 میں کانگریس نے یہ اعلان کیا کہ اس کا مقصد ایک سماج وادی معاشرے کی تشکیل ہے۔ سب سوشلسٹوں کے لیے یہ کافی مشکل ہوگیا کہ وہ خود کو کانگریس کے متبادل کی حیثیت سے پیش کرسکیں۔ ان میں سے کچھ، جن کی رہنمائی رام منوہر لوہیا کرتے تھے، کانگریس سے اور زیادہ دور ہوگئے اور اس پر تنقید بھی بڑھادی۔ کچھ اور سوشلسٹ جیسے کہ اشوک مہتہ کانگریس سے محدود تعاون کے حامی تھے۔

آچاریہ نریندر دیو

(1889-1956)

مجاہد آزادی اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے بانی صدر؛ آزادی کی تحریک کے دوران کئی بار جیل گئے؛ کسانوں کی تحریک میں پیش پیش رہے؛ بودھ مذہب کے عالم؛ آزادی کے بعد سوشلسٹ پارٹی کے اور بعد میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کے۔

سوشلسٹ پارٹی کئی بار ٹوٹی اور ایک ہوئی۔ نتیجے کے طور پر کئی سوشلسٹ پارٹیاں بن گئیں۔ ان میں کسان مزدور پرجا پارٹی، پرجا سوشلسٹ پارٹی اور متحدہ سوشلسٹ پارٹی اہم ہیں۔ اس پارٹی کے نمایاں لیڈروں میں جے پرکاش نارائن، اچیوت پٹوردھن، اشوک مہتہ، آچاریہ نریندر دیو، رام منوہر لوہیا اور ایس۔ ایم۔ جوشی کے نام لیے جاتے ہیں۔ آج کل کی کئی پارٹیاں جیسے سماج وادی پارٹی، راشٹریہ جنتا دل، جنتا دل (یونائیٹڈ) اور جنتا دل (سیکولر) اپنی جڑیں سوشلسٹ پارٹی ہی میں بتاتی ہیں۔

© NCERT not to be republished

کانگریس بالادستی کی نوعیت

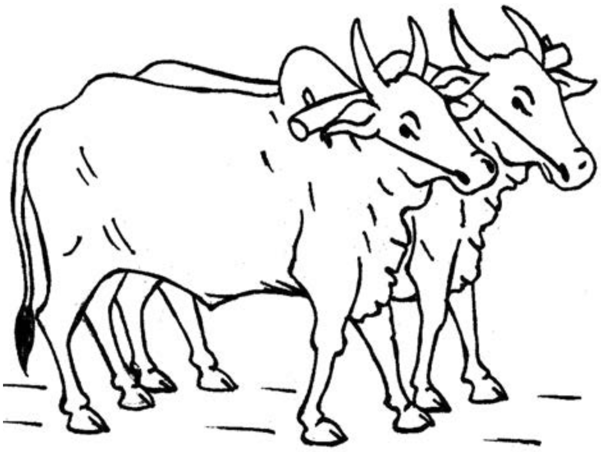

ہندوستان اکیلا ملک نہیں ہے جس نے ایک پارٹی کے غلبہ یا بالادستی کا تجربہ کیا ہو۔ اگر ہم دنیا پر نظر ڈالیں تو ہمیں ایک پارٹی کی بالادستی کی کئی مثالیں ملیں گی۔ لیکن ان مثالوں اور ہندوستان کے تجربے میں بہت اہم فرق ہے۔ بقیہ تمام مثالوں میں ایک پارٹی کی بالادستی میں جمہوریت کی قربانی شامل ہے۔ چین، کیوبا اور شام جیسے ممالک میں دستور نے صرف ایک ہی پارٹی کو حکومت کی اجازت دی ہے۔ کچھ دوسرے ممالک جیسے میانمار، بیلا روس، مصر اور ایریٹیریا فوجی اور قانونی اسباب کی بنیاد پر عملاً ایک پارٹی ممالک ہیں۔ کچھ سال پہلے تک میکسکو، جنوبی کوریا اور تائیوان بھی عملی طور سے ایک پارٹی والی ریاستیں تھیں لیکن ان تمام ملکوں اور ہندوستان کے معاملہ میں واضح فرق یہ تھا کہ یہاں کانگریس کی بالادستی جمہوری حالات میں قائم ہوئی۔ یہاں کئی پارٹیوں نے عادلانہ اور منصفانہ الیکشن میں حصہ لیا اور کانگریس الیکشن کے بعد الیکشن میں کامیابی حاصل کرتی چلی گئی۔ یہ صورت حال جنوبی افریقہ میں افریقہ نیشنل کانگریس کی اس بالادستی سے مشابہت رکھتی ہے جو اس نے نسلی علاحدگی پسندگی کے خاتمے کے بعد حاصل کی۔

باباصاحب بھیم راؤ رام جی امبیڈکر
(1891-1956)

ذات پات مخالف تحریک اور دلتوں کے لیے انصاف کی جدوجہد کے لیڈر؛ انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی کے بانی بعد میں شیڈیول کاسٹ فیڈریشن بنائی؛ ری پبلکن پارٹی آف انڈیا کے منصوبہ کار، دوسری جنگ عظیم میں وائسرائے کی انتظامیہ کابینہ کے ممبر، دستور تحریر کرنے والی کمیٹی کے صدر آزادی کے بعد نہرو کی وزارت میں وزیر، ہندو کوڈ بل پر اختلاف کے سبب 1951 میں استعفیٰ دے دیا۔ 1956 میں ہزاروں پیر کاروں کے ساتھ بدھ مذہب اختیار کیا۔

پی۔ آر۔ آئی 1929 میں قائم ہوئی۔ پورا نام نیشنل ریوولوشنری پارٹی تھا اور بعد میں انسٹی ٹیوشنل ریوولوشنری پارٹی نام اختیار کیا۔ پی۔ آر۔ آئی (اسپینی زبان میں) میکسکو میں تقریباً چھ دہائیوں تک برسرِاقتدار رہی۔ یہ میکسکو انقلاب کی وراثت کی نمائندہ تھی۔ شروع میں پی آر آئی کئی سیاسی پارٹیوں، مزدور تنظیموں فوجی اور سیاسی لیڈروں کے مفادات کا مجموعہ تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد پی آر آئی کے بانی پلوٹارکو الیس کالاس (Plutarco Elias Calles) نے پارٹی اور اقتدار دونوں پر قبضہ کرلیا۔ الیکشن معمول کے مطابق ہوتے رہے اور ہر بار پی آر آئی ہی کامیاب ہوئی۔ دوسری پارٹیاں صرف نام ہی کی تھیں تاکہ حکمراں پارٹی کو زیادہ قانونی استحقاق حاصل ہو سکے۔ انتخابی قوانین کچھ اس طرح عمل میں لائے جاتے تھے جس سے پی آر آئی کی جیت یقینی ہو سکے۔ اکثر الیکشن میں حکمراں پارٹی دھاندلی کرتی تھی اور جوڑ توڑ سے کام لیتی تھی۔ اس کی حکمرانی کو 'مکمل آمریت' سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ آخر کار 2000 میں ہونے والے صدارتی الیکشن میں پارٹی کو شکست ہوئی۔ اب میکسکو میں ایک پارٹی کا غلبہ نہیں ہے۔ لیکن ان چالوں سے جو پی آر آئی کے دوران حکومت استعمال ہوئیں جمہوریت کی نشوونما کافی عرصہ تک بُری طرح متاثر ہوئی۔ عوام کو الیکشن کی عادلانہ اور منصفانہ نوعیت پر اب بھی اعتماد نہیں ہے۔

© NCERT not to be republished

رفیع احمد قدوائی
(1894-1954)
اتر پردیش کے کانگریس لیڈر؛ 1937 اور 1946 میں اتر پردیش کے وزیر؛ آزاد ہندوستان کی پہلی کابینہ میں وزیر مواصلات؛ اس کے علاوہ وزیر زراعت وخوراک 54-1952

کانگریس پارٹی کی اس غیر معمولی کامیابی کی جڑیں دراصل آزادی کی جدوجہد میں پنہاں تھیں۔ کانگریس کو قومی تحریک کا وارث سمجھا جاتا ہے۔ وہ رہنما جو آزادی کی جنگ میں پیش پیش تھے اب کانگریس کے امیدواروں کی حیثیت سے الیکشن لڑ رہے تھے۔ کانگریس پہلے ہی سے ایک منظّم پارٹی تھی اور جس وقت دوسری سیاسی پارٹیاں اپنی حکمت عملی پر غور کرتیں، کانگریس اپنی مہم یا پرچار شروع کر دیتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر پارٹیاں آزادی کے وقت یا پھر اس کے بعد وجود میں آئیں۔ تو کانگریس کو 'خشتِ اوّل' ہونے کا فائدہ حاصل تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ آزادی کے وقت ہی کانگریس پارٹی ملک کے طول وعرض میں پھیل چکی تھی اور ساتھ ہی مقامی اور دیہی سطح پر بھی اپنے قدم جما چکی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ابھی تک کانگریس قومی تحریک تھی اس کی نوعیت ہمہ گیر تھی۔ ان تمام عناصر نے کانگریس کی بالا دستی میں اہم کردار ادا کیا۔

کانگریس بطور ایک سماجی اور نظریاتی اتحاد

آپ پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح کانگریس 1885 میں تعلیم یافتہ، پیشہ ور اور تجارت پیشہ لوگوں کے ایک پریشر گروپ کی حیثیت سے رفتہ رفتہ بیسویں صدی کی ایک عوامی تحریک میں بدل گئی۔ اسی نے اس کو ایک عوامی سیاسی پارٹی بننے میں مدد دی اور نتیجے کے طور پر سیاسی نظام میں اس کے غلبہ اور بالا دستی کے حصول میں بھی۔ اس طرح سے کانگریس کی ابتدا ایک انگریزی بولنے والے، اونچی ذات کے اوسط درجہ کے بالائی سطح والے اور ممتاز شہری افراد کے زیر اثر ہوئی لیکن ہر سِول نافرمانی کی تحریک کے ساتھ ساتھ اس کی معاشرتی اور سماجی بنیاد وسیع ہوتی گئی۔ اس نے مختلف گروہوں کو اکٹھا کیا جن میں سے اکثر کے مفادات متضاد بھی ہوتے تھے۔ کسان اور سرمایہ کار، شہری اور دیہاتی، مزدور اور مالک، نچلے، اوسط اور اونچے درجہ اور ذات والے، سب نے کانگریس میں اپنے لیے جگہ پائی۔ رفتہ رفتہ اس کی باگ ڈور بھی اعلیٰ ذات اور اعلیٰ درجے کے پیشہ وروں سے زرعی اور دیہی پس منظر میں ابھرے ہوئے رہنماؤں کی طرف جانے لگی۔ آزادی کے وقت کانگریس ایک ایسی معاشرتی اور سماجی قوس وقزح کی مانند تھی جو ہندوستان کے مختلف اور متنوع مفادات، زبانوں، مذہبوں، ذاتوں اور طبقوں کی نمائندگی کرتی تھی۔

ان میں سے اکثر نے اپنی شناخت کو کانگریس میں سمو دیا اور یوں بھی ہوا کہ بہت سے افراد اور گروہ کانگریس میں شمولیت کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف خیالات رکھتے رہے۔ اس طرح سے کانگریس نظریاتی اشتراک یا اختلاط کا مرکز بھی تھی۔ اس میں انقلابی، امن پسند، قدامت پرست، ترقی پسند، انتہا پسند، اعتدال پسند، دائیں اور بائیں بازو والے سبھی لوگ شامل تھے۔

پہلے ہم ایک پارٹی کے اندر گٹھ بندھن دیکھتے تھے لیکن اب پارٹیوں کا گٹھ بندھن ہوتا ہے۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ 1952 سے گٹھ بندھن سرکار ہمارے یہاں موجود ہے؟

© NCERT not to be republished

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا

1920 کی دہائی کے شروع میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کمیونسٹ گروہوں کا ظہور ہونے لگا تھا جن کو روس کے بالشویک انقلاب سے ترغیب ملی تھی۔ان کے خیال میں ملک کے مختلف مسائل کا حل سوشلزم یا سماج واد میں پنہاں تھا۔1935 سے کمیونسٹ کانگریس پارٹی کے اندر ہی سے کام کرتے تھے لیکن دسمبر 1941 میں الگ ہونے کا وقت آ گیا جب کہ کمیونسٹوں نے نازی جرمنی کے خلاف جنگ میں برطانیہ کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ آزادی کے وقت دوسری غیر کانگریس پارٹیوں کے برعکس کمیونسٹ پارٹی (CPI) کا ڈھانچہ زیادہ متحرک اور اس کا عملہ زیادہ مخلص اور سرگرم عمل تھا۔لیکن آزادی نے پارٹی کے اندر ہی سوالات کھڑے کردیئے۔کیا یہ آزادی مصنوعی ہے یا ہندوستان واقعی آزاد ہے؟

آزادی کے فوراً بعد پارٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ 1947 میں اقتدار کی منتقلی سچی آزادی نہیں تھی اور تلنگانہ میں پرتشدد ہنگاموں کی حوصلہ افزائی کی۔اپنے اس نظریے کے لیے کمیونسٹوں کو عوامی حمایت حاصل نہ ہوسکی اور فوج نے اس تحریک کو کچل دیا۔اس نے اُن کو اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور کیا۔1951 میں کمیونسٹ پارٹی نے پُرتشدد انقلاب کا راستہ چھوڑ کر آنے والے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ پہلے عام الیکشن میں سی پی آئی کو 16 سیٹیں ملیں اور وہ سب سے بڑی حزب مخالف کی صورت میں سامنے آئی۔ پارٹی کو زیادہ تر حمایت آندھرا پردیش، مغربی بنگال، بہار اور کیرالا سے ملی۔

اے۔کے۔گوپالن، ایس۔اے۔ڈانگے، ای۔ایم۔ایس نمبودری پد، پی۔سی۔ جوشی، اجے گھوش اور پی۔سندر یا کمیونسٹ پارٹی کے صفِ اوّل کے رہنما تھے۔ سوویت یونین اور چین کے نظریاتی اختلافات کی وجہ سے پارٹی بھی دو حصّوں میں بٹ گئی۔سوویت یونین کی حامی فریق CPI ہی رہی، جب کہ مخالف ممبروں نے CPI (M) کی بنیاد ڈالی۔یہ دونوں پارٹیاں آج بھی موجود ہیں۔

اے۔کے۔گوپالن

(1904-1977)

کیرالا کے کمیونسٹ لیڈر، شروع میں کانگریس کارکن کی حیثیت سے کام کیا؛ 1939 میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوئے؛ 1964 میں کمیونسٹ پارٹی کی تفریق کے بعد سی۔پی۔ آئی (ایم) میں شامل ہوئے اور پارٹی کو مضبوط بنانے کے لیے کام کیا؛ ایک باوقار پارلیمانی رکن؛ 1952 سے پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔

© NCERT not to be republished

آیئے ایک فلم دیکھیں

''سمہاسن''

یہ مراٹھی فلم جو ارون سادھو کے دوناولوں 'سمہاسن' اور 'ممبئی دنانک' پر مبنی مہاراشٹرا کی وزارت اعلیٰ کے لیے رسہ کشی کی منظرکشی کرتی ہے۔ یہ کہانی ایک صحافی ڈیگوٹپنس کے ذریعہ بیان کی گئی ہے جو خاموش 'سوتر دھار' ہے۔ کہانی کی کوشش حکمراں پارٹی کے اندر طاقت کے حصول کی شدید کشمکش اور حزب مخالف کے ثانوی کردار کو گرفت میں لینا ہے۔

وزیر خزانہ وشواس راؤ دابھدے کی پوری کوشش ہے کہ موجودہ وزیر اعلیٰ کو کرسی سے ہٹا دیا جائے۔ دونوں ہی امیدوار یونین لیڈر ڈی کاسٹا کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اس کی خوشامد کرتے ہیں۔ دو فریقوں کی اس روایتی جنگ سے دوسرے سیاست داں بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور دونوں امیدواروں سے سودے بازی کرتے ہیں۔ ممبئی میں اسمگلنگ اور دیگر سنگین سماجی حقائق اس فلم کے ذیلی موضوعات ہیں۔

سال: 1981
ہدایت کار: جبّار پٹیل
اسکرین پلے: وجے تندولکر
کردار: نیلو پھلے، ارون سرنائک، ڈاکٹر شری رام لاگو، ستیش دوباشی، دتا بھٹ، مدھوکر توراول، مادھو واٹوے، موہن اگاشے۔

کانگریس مختلف مفادات فرقوں حتٰی کہ سیاسی پارٹیوں کے لیے بھی ایک 'پلیٹ فارم' کی طرح تھی جہاں سے وہ قومی تحریک میں حصہ لے سکتے تھے۔ آزادی سے قبل کے ہندوستان میں بہت سی تنظیموں کو اپنے دستور اور انتظامی ڈھانچے کے ساتھ کانگریس میں رہنے کی اجازت تھی۔ ان میں سے کچھ بعد میں کانگریس سے الگ ہوگئیں اور حزب مخالف بن گئیں جیسے کہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی۔ طریقۂ کار، پروگرام اور پالیسیوں کے اختلاف کے باوجود پارٹی ایک رائے عامہ ہموار کرنے میں کامیاب رہی اور اگر چہ وہ اختلافات ختم نہ کر پائی لیکن ان کو بڑھنے بھی نہ دیا۔

دھڑوں کی برداشت اور ان کا بندوبست

کانگریس کے ملے جلے طرز نے اس کو غیر معمولی تقویت بخشی۔ اوّل تو یہ کہ مخلوط تنظیم ہر شامل ہونے والے کو قبول کرتی ہے لہٰذا وہ کوئی انتہا پسند روش اختیار نہیں کرسکتی اور ہر معاملے میں اس کو اعتدال سے کام لینا پڑتا ہے۔ سمجھوتہ اور تحمل ایک مخلوط تنظیم کی علامت اور ثبوت ہیں۔ اس حکمت عملی نے حزب مخالف کو مشکل میں ڈال دیا۔ حزب مخالف جو کچھ بھی کہنا چاہتی وہ کانگریس کے پروگرام اور نظریات میں جگہ پاسکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس میں ایک ملی جلی طرز کی پارٹی میں اندرونی اختلافات کو برداشت کرنے اور الگ الگ گروہوں یا جتھوں کی امنگوں اور رہنماؤں سے ہم آہنگ ہونے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے درمیان کانگریس نے یہ دونوں چیزیں کیں بلکہ آزادی کے بعد بھی اسی نہج پر چلتی رہی۔ اسی وجہ سے اگر کوئی گروہ یا جتھا پارٹی کے موقف سے خوش نہ ہوتا، یا طاقت میں اپنے حصے کو کافی نہ سمجھتا تو بھی وہ بجائے پارٹی چھوڑ کر اپوزیشن میں جانے کے پارٹی میں رہ کر ہی لڑائی لڑنے کو بہتر سمجھتا تھا۔ پارٹی کے اندر یہ گروہ دھڑے یا جتھے کہلاتے ہیں۔ کانگریس کے مخلوط کردار نے ان جتھوں کو نہ صرف برداشت کیا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ان میں سے کچھ جتھے تو نظریاتی ٹکراؤ کی وجہ سے بنے تھے لیکن اکثر اوقات ان جتھوں کی بنیاد ذاتی اغراض و مقاصد اور

بھارتیہ جن سنگھ

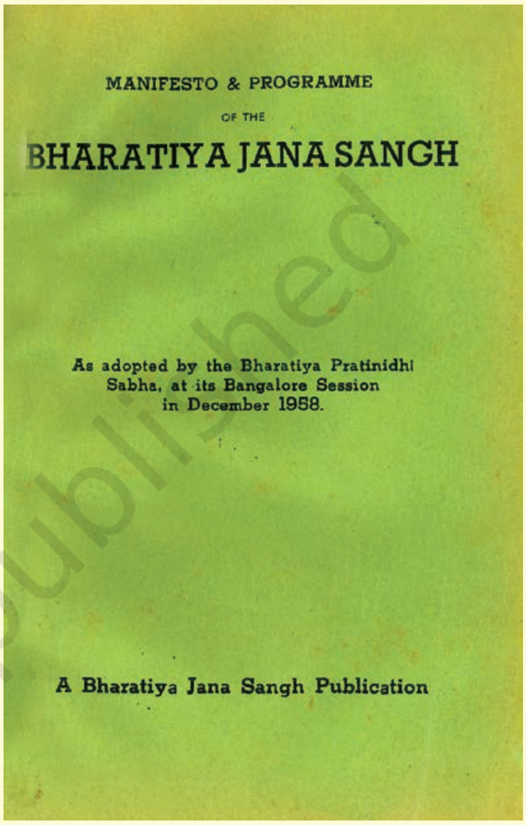
MANIFESTO & PROGRAMME

OF THE

BHARATIYA JANA SANGH

As adopted by the Bharatiya Pratinidhi Sabha, at its Bangalore Session in December 1958.

A Bharatiya Jana Sangh Publication

بھارتیہ جن سنگھ 1951 میں قائم ہوئی۔ شیاما پرساد مکھرجی اس کے بانی صدر تھے۔ اس کا سلسلہ بہرحال آزادی سے قبل کی راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (RSS) اور ہندو مہاسبھا سے ملتا ہے۔

جہاں تک پروگرام اور نظریات کا تعلق ہے جن سنگھ دوسری پارٹیوں سے علاحدہ تھی۔ اس نے ایک ملک، ایک تہذیب اور ایک قوم کے تصور کو فروغ دیا اور یہ یقین رکھا کہ ملک ہندوستانی روایات اور تہذیب کے بل بوتے پر جدید، مضبوط اور ترقی یافتہ ہوسکتا ہے۔ پارٹی نے اکھنڈ بھارت کے اندر ہندوستان اور پاکستان کو ایک کرنے کی تجویز بھی کی۔ انگریزی کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان بنانے کی حمایت میں ہونے والے مظاہروں میں پارٹی پیش پیش تھی۔ یہ تہذیبی اور مذہبی اقلیتوں کو مراعات دینے کی بھی مخالف تھی۔ 1964 کے چین کے ایٹمی تجربے کے بعد جن سنگھ مستقل ہندوستان کے نیوکلیائی ہتھیاروں کو فروغ دینے پر زور دیتی رہی۔

دین دیال اپادھیائے

(1916-1968)

1942 سے آر ایس ایس کے کل وقتی ممبر؛ بھارتیہ جن سنگھ کے بانیوں میں سے ایک، بھارتیہ جن سنگھ کے سکریٹری اور بعد میں صدر ''متحدہ انسانیت'' کے تصور کی شروعات کی۔

پچاس کی دہائی میں جن سنگھ انتخابی سیاست میں حاشیے پر رہی اور لوک سبھا کے 1952 اور 1957 کے الیکشن میں بالترتیب تین اور چار سیٹیں حاصل کرسکی۔ ابتدائی سالوں میں اس کی زیادہ تر حمایت ہندی بولنے والی ریاستوں جیسے راجستھان، مدھیہ پردیش، دہلی اور اترپردیش کے شہری علاقوں سے آئی۔ پارٹی کے اہم رہنماؤں میں شیاما پرساد مکھرجی، دین دیال اپادھیائے اور بلراج مدھوک کے نام قابل ذکر ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کا جنم بھارتیہ جن سنگھ سے ہی ہوا ہے۔

© NCERT not to be republished

میرا خیال تھا کہ گروہ بندی ایک بیماری ہے جس کا علاج ہونا چاہیے۔ لیکن آپ تو ایسا کہہ رہے ہیں کہ گروہ بندی ایک عام اور اچھی چیز ہے۔

دشمنی یا مسابقت پر مبنی ہوتی تھی۔ اس طرح اندرونی گروہ بندی بجائے کمزوری کے کانگریس کے لیے طاقت کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ کیوں کہ کانگریس کے اندر مختلف گروہوں کو آپس میں لڑنے کی آزادی تھی اس لیے وہ لیڈر، جو الگ الگ مفاد اور نظریات کی نمائندگی کرتے تھے، کانگریس ہی میں رہے اور باہر جا کر نئی پارٹی نہیں بنائی۔

کانگریس کے اکثر ریاستی یونٹ بھی ان ہی جتھوں یا گروہوں کا مجموعہ تھے۔ ان جتھوں کے علاحدہ نظریات کی وجہ سے کانگریس ایک عظیم مرکزی پارٹی نظر آنے لگی۔ دوسری پارٹیوں نے ان جتھوں پر اپنا اثر استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح 'کنارے' پہ رہ کر بالواسطہ طور سے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ یہ پارٹیاں حقیقی طاقت کے استعمال سے بہت دور کر دی گئی تھیں۔ یہ حکمراں پارٹی کا متبادل تو نہیں تھیں لیکن یہ مستقل طور سے کانگریس پر نکتہ چینی اور اس کی ملامت کرتی تھیں اور اس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتی تھیں۔ جتھوں کے اس نظام نے حکمراں پارٹی کے اندر ایک توازن برقرار رکھا اور سیاسی زور آزمائی کانگریس کے اندر ہی محدود دور رہی۔ یعنی ایک طرح سے انتخابی مقابلوں کے پہلے دس سال میں کانگریس نے حکمراں پارٹی اور اپوزیشن دونوں کا کردار نبھایا۔ اسی لیے ہندوستانی سیاست کے اس زمانے کو 'کانگریس سسٹم' کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔

اپوزیشن پارٹیوں کا ظہور

جو کچھ بھی ہم نے اوپر پڑھا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان میں اپوزیشن پارٹیاں یا حزب مخالف موجود نہیں تھے۔ الیکشن کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے ہم نے کانگریس کے علاوہ اور بھی کئی پارٹیوں کے نام لیے تھے۔ اس وقت بھی ہندوستان میں کئی کثیر الجماعت جمہوری ملکوں سے زیادہ سرگرم اور متنوع پارٹیاں موجود تھیں۔ ان میں سے اکثر 1952 کے پہلے عام الیکشن سے قبل وجود میں آئی تھیں اور ان میں سے کئی نے چھٹی اور ساتویں دہائی کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ آج کی کم و بیش تمام غیر کانگریس پارٹیوں کی جڑ میں 1950 کی کسی اپوزیشن پارٹی میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

اس زمانے میں تمام اپوزیشن پارٹیاں لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں میں صرف ایک علامتی نمائندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اس کے باوجود ان کی موجودگی نے نظام کے جمہوری کردار کو برقرار رکھنے میں مدد کی۔ ان پارٹیوں نے کانگریس کی پالیسیوں اور عمل پر حق بجانب اور بااصول تنقید کی جس کی وجہ سے کانگریس پارٹی قابو سے باہر نہ گئی اور اس طرح کانگریس کے اندر طاقت میں توازن اور اعتدال قائم رہا۔

''رسہ کشی کی جنگ'' (29 اگست 1954) ایک کارٹونسٹ کا حکمراں اور اپوزیشن پارٹیوں کی طاقت توازن کے بارے میں تاثر ہے۔ درخت پر نہرو اور ان کی کابینہ کے ساتھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپوزیشن لیڈر جو درخت گرانے کی کوشش کر رہے ہیں ان میں اے۔ کے۔ گوپالن، آچاریہ کرپلانی، این۔ سی۔ چٹرجی، سری کانتن نائر اور سردار حکم سنگھ شامل ہیں۔

© NCERT not to be republished

سوتنتر پارٹی

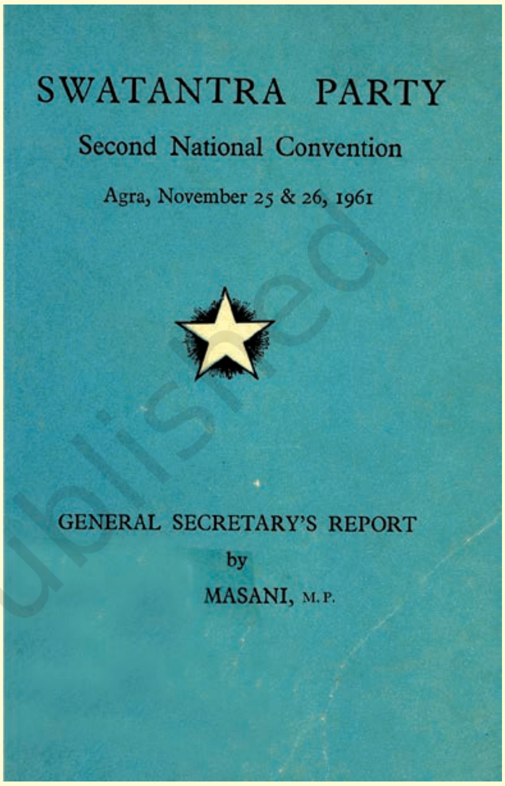

اگست 1959 میں سوتنتر پارٹی اس وقت قائم ہوئی جب کانگریس نے ناگپور قرارداد میں زمین کی سیلنگ، حکومت کا اناج کی تجارت کو قبضہ میں لینا اور مشترک زراعت کو اختیار کیا۔ اس پارٹی کے بزرگ کانگریس رہنماؤں میں راج گوپال آچاری، کے۔ ایم۔ منشی، این۔ جی۔ رانگا اور مینو مسانی شامل تھے۔ یہ پارٹی اپنے معاشی موقف کی وجہ سے دوسری پارٹیوں سے ممتاز تھی۔

سوتنتر پارٹی کا خیال تھا کہ حکومت کو اقتصادی معاملات میں کم سے کم دخل دینا چاہیے۔ اس کے نظریے کے مطابق خوش حالی صرف شخصی آزادی کے ذریعے ہی آسکتی ہے۔ یہ اقتصادیات میں حکومت کی دخل اندازی، مرکزی منصوبہ بندی، عوامی شعبہ اور قومیانے کی پالیسی پر تنقید کرتی تھی اور پرائیویٹ سیکٹر کو وسعت دینے کے حق میں تھی۔ سوتنتر پارٹی زرعی زمین کی سیلنگ، مشترک کاشت کاری اور سرکاری تجارت کی بھی مخالف تھی۔ یہ تدریجی ٹیکس ڈھانچے کی بھی مخالف تھی اور اس نے لائسنس ڈھانچہ (regime) کو توڑنے کا مطالبہ کیا۔ یہ ناوابستگی کی پالیسی اور روس سے خوش گوار تعلقات سے بھی پریشان تھی۔ اس نے یونائیٹڈ اسٹیٹس سے قریبی تعلقات رکھنے کا مطالبہ کیا۔ سوتنتر پارٹی نے ملک کی مختلف علاقائی پارٹیوں اور مفادات کو خود میں ضم کر کے قوت حاصل کی۔ اس پارٹی میں جاگیرداروں اور راجاؤں کے لیے کشش تھی جن کا مقصد اپنی اس زمین اور وقار کا تحفظ تھا جو زمینی اصلاحات کے قانون کے باعث خطرے میں پڑ گئے تھے۔ سرمایہ دار اور تاجر طبقہ، جو قومی ملکیت کاری اور لائسنس کی پالیسی کے خلاف تھا، سوتنتر پارٹی کا حامی بن گیا۔ پارٹی کی سماجی بنیاد کمزور تھی اور مخلص کارکنوں کا فقدان تھا۔ لہٰذا یہ ایک مضبوط تنظیمی ڈھانچہ بنانے میں ناکام رہی۔

سی۔ راج گوپال آچاری (1878-1972)

کانگریس کے بزرگ رہنما اور ادیب؛ مہاتما گاندھی کے قریبی ساتھی؛ دستور ساز اسمبلی کے ممبر؛ ملک کے ہندستانی پہلے گورنر جنرل (1948-1950) مرکزی کابینہ میں وزیر، بعد میں ریاست مدراس کے وزیر اعلیٰ؛ ہندوستان کے پہلے بھارت رتن حاصل کرنے والے؛ سوتنتر پارٹی کے بانی (1959)

© NCERT not to be republished

ایک سیاسی اور جمہوری متبادل کی امید کو زندہ رکھنے سے ان پارٹیوں نے درحقیقت نظام کے خلاف ناراضگی جمہوریت مخالف ہونے سے بچالیا۔ان پارٹیوں نے ان لیڈروں کی تربیت بھی کی جنھیں بعد میں ملک کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔

ابتدائی سالوں میں کانگریس اور حزب مخالف کے رہنماؤں کے درمیان کافی باہمی احترام تھا۔آزادی کے اعلان کے بعد اور پہلے عام انتخابات سے قبل جس عارضی حکومت نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی اس میں ڈاکٹر امبیڈکر اور شیاما پرساد مکھر جی جیسے اپوزیشن کے لیڈر کابینہ میں شامل تھے۔جواہر لعل نہرو نے اکثر سوشلسٹ پارٹی کی پسندیدگی کا اظہار کیا اور جے پرکاش نارائن جیسے سوشلسٹ لیڈروں کو حکومت میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی۔ذاتی تعلقات کی یہ نوعیت اور سیاسی حریفوں کا عزت واحترام پارٹیوں کی مقابلہ آرائی کی شدت کے ساتھ ساتھ ختم ہوگیا۔

اس طرح ہماری جمہوری سیاست کا پہلا دور منفرد تھا۔کانگریس نے جس قومی تحریک کی قیادت کی تھی اس کی ہمہ گیری کے باعث کانگریس میں وہ کشش پیدا ہوگئی جس سے مختلف گروہ، طبقات اور مفادات اس کی جانب کھنچے چلے آئے اور یہ وسیع بنیادوں پر مبنی ایک سماجی اور نظریاتی طور پر مخلوط پارٹی بن گئی۔آزادی کی جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کرنے کی وجہ سے کانگریس پارٹی کو دوسروں کے مقابلے میں ایک بہتر شروعات نصیب ہوئی۔

> ”بعض کانگریسیوں کے نزدیک حکومت یا کانگریس میں میری موجودگی اتنی اہم نہیں جتنی کہ ٹنڈن کا الیکشن ..... کانگریس اور حکومت دونوں میں میری افادیت ختم ہوچکی ہے۔“
>
> **جواہر لعل نہرو**
>
> کانگریس کے عہدے پر اپنی مرضی کے خلاف ٹنڈن کی جیت کے بعد راجا جی کو لکھے گئے ایک خط کے الفاظ

1948 میں گورنر جنرل چکرورتی راج گوپال آچاری کی حلف برداری کے بعد نہرو کی کابینہ (بیٹھے ہوئے بائیں سے دائیں) رفیع احمد قدوائی، بلدیو سنگھ، مولانا آزاد، وزیر اعظم نہرو، چکرورتی راج گوپال آچاری، سردار ولبھ بھائی پٹیل، راج کماری امرت کور، مسٹر جان متھائی، اور جگ جیون رام (کھڑے ہوئے بائیں سے دائیں) جناب گاڈگل، جناب نیوگی، ڈاکٹر امبیڈکر، شیاما پرساد مکھر جی، گوپالا سوامی آئینگر اور جے رام داس دولت رام۔

بہار کے ایک گاؤں میں پارٹی کے اندر مقابلہ

فانیشور ناتھ رینو

جب دو بھینسے آپس میں لڑتے ہیں تو ان کے نیچے کی گھاس مسل جاتی ہے۔ کانگریس اور سوشلسٹ پارٹی ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہی ہیں۔ دونوں نئے ممبروں کو شامل کرنا چاہتی ہیں۔ غریب آدمی چکّی کے دو پاٹوں کے بیچ پس جائے گا!

''نہیں، غریب آدمی نہیں پسے گا۔ بلکہ حقیقت میں اس کو فائدہ ہوگا۔'' کسی نے جواب دیا۔'' کام صرف ایک ہی پارٹی نہیں مکمل کرتی۔ دو گروہوں کے درمیان مقابلہ اور حریفانہ کشمکش سے ہی عوام کا فائدہ ہوتا ہے.....''

سوشلسٹ پارٹی کی میٹنگ کی خبر سے سنتھالیوں کو کافی تشویش تھی۔ اسپتال کھلنے کی خبر نے ان پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا۔ انھیں گاؤں کے جھگڑوں اور نہ ہی دوستوں اور دشمنوں کی زیادہ پرواہ تھی۔ لیکن یہ میٹنگ زمین پر ہل چلانے والوں کی میٹنگ تھی .... ''زمین کس کی ملکیت ہے؟ کسان کی! جو ہل چلائے گا وہ بیج بوئے گا، جو بیج بوئے گا وہی فصل کاٹے گا۔ جو کام کرے گا وہی کھائے گا، چاہے کچھ ہو جائے!'' کالی چرن نے اپنی تقریر میں کہا

کانگریس کے ضلع آفس میں بھی بڑی ہلچل تھی۔ ان کو پارٹی کا صدر منتخب کرنا تھا۔ چار امیدوار میدان میں تھے۔ دو اصلی اور دو نقلی۔ یہ راجپوتوں اور بھومی ہاروں کے درمیان مقابلہ تھا۔ دونوں ذاتوں کے دولت مند تاجر اور زمیندار موٹر کاروں پر پورے ضلع کا دورہ کر رہے تھے اور ایک دوسرے پر خوب کیچڑ اچھال رہے تھے۔ کٹیہار سوت مل کا مالک سیٹھ بھومی ہار پارٹی کا نمائندہ تھا اور فاربی گینگ جوٹ مل کا مالک راجپوتوں کا نمائندہ تھا..... جو پیسہ وہ پھینک رہے ہیں آپ کو اُسے دیکھنا چاہیے۔

فانیشور ناتھ کے ناول 'میلا آنچل' کے ایک اقتباس کا ترجمہ۔ یہ ناول آزادی کے بعد کے ابتدائی سالوں میں مشرقی بہار کے ضلع پورنیا کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

جوں جوں تمام مفادات اور سیاسی طاقت کے امیدواروں سے موافقت اور ہم آہنگی کی صلاحیت کانگریس میں کم ہوتی گئی، دوسری پارٹیاں زیادہ اہمیت حاصل کرتی گئیں۔ ملک کی سیاست میں کانگریس کی بالادستی صرف ایک پہلو کو ظاہر کرتی ہے۔ ہم اس کتاب کے بقیہ حصّوں میں دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر ڈالیں گے۔

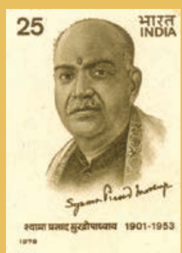

شیاما پرساد مکھرجی
(1901-1953)

ہندو مہاسبھا کے لیڈر؛ بھارتیہ جن سنگھ کے بانی؛ آزادی کے بعد نہرو کی پہلی کابینہ میں وزیر؛ پاکستان سے تعلقات کے سوال پر اختلاف کی وجہ سے 1950 میں استعفیٰ دیا؛ دستور ساز اسمبلی کے ممبر اور بعد میں پہلی لوک سبھا کے ممبر؛ جموں اور کشمیر کو خود اختیاری دینے کی حکومت کی پالیسی کے مخالف؛ جن سنگھ کے کشمیر پالیسی کے خلاف مظاہروں میں گرفتار کیے گئے؛ جیل ہی میں انتقال ہوا۔

© NCERT not to be republished

مشقیں

.1 خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے صحیح جواب کا انتخاب کیجیے:

(a) 1952 کے پہلے عام الیکشن میں لوک سبھا اور .... کا الیکشن ساتھ ساتھ ہوا تھا۔
(ہندوستان کے صدرجمہوریہ / ریاستی اسمبلیوں / راجیہ سبھا / وزیراعظم)

(b) پہلے عام الیکشن میں جس پارٹی نے دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ سیٹیں حاصل کیں اس کا نام .... تھا۔
(پرجاسوشلسٹ پارٹی / بھارتیہ جن سنگھ / کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا / بھارتیہ جنتا پارٹی)

(c) سوتنتر پارٹی کے رہنما اصولوں میں سے ایک .... تھا
(مزدور طبقہ کا مفاد / راجاؤں کی ریاست کا تحفظ / حکومت سے آزاد معیشت / یونین کے ڈھانچہ میں ریاستوں کی خود مختاری)

.2 فہرست 'A' کے لیڈروں کو فہرست 'B' کی پارٹیوں سے ملا کر جوڑی بنائیے

فہرست 'A'	فہرست 'B'
(a) ایس۔اے۔ڈانگے	i. بھارتیہ جن سنگھ
(b) شیاما پرساد مکھرجی	ii. سوتنتر پارٹی
(c) مینو مسانی	iii. پرجا سوشلسٹ پارٹی
(d) اشوک مہتہ	iv. کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا

.3 ایک پارٹی کی بالادستی کے حوالے سے نیچے چار بیان دیے گئے ہیں۔ ان پر صحیح یا غلط کا نشان لگائیے۔

(a) ایک پارٹی کی بالادستی کی وجہ سیاسی پارٹیوں میں ایک مضبوط متبادل کی عدم موجودگی ہے۔

(b) کمزور رائے عامہ کی وجہ سے ایک پارٹی کی بالادستی قائم ہوتی ہے۔

(c) ایک پارٹی کی بالادستی کا سلسلہ قوم کے نوآبادیاتی ماضی سے جڑتا ہے۔

(d) ایک پارٹی کی بالادستی ملک میں جمہوری تصورات کی عدم موجودگی کو ظاہر کرتی ہے۔

.4 اگر پہلے الیکشن کے بعد بھارتیہ جن سنگھ یا کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے حکومت بنائی ہوتی تو کن پہلوؤں میں حکومت کی پالیسیاں مختلف ہوتیں؟ دونوں پارٹیوں کے لیے تین تین مثالیں دیجیے۔

.5 کانگریس کس طرح سے ایک نظریاتی اتحاد کہی جاسکتی تھی؟ ان نظریاتی لہروں کا بیان کیجیے جو کانگریس میں موجود تھیں۔

© NCERT not to be republished

6. کیا ایک پارٹی کی بالادستی کی موجودگی نے ہندوستانی سیاست کی جمہوری نوعیت کو نا موافق طور پر متاثر کیا ہے؟

7. سوشلسٹ پارٹیوں اور کمیونسٹ پارٹی نیز بھارتیہ جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی کے درمیان تین تین فرق واضح کیجیے۔

8. آپ کے خیال میں ایک پارٹی کی بالادستی کے تحت میکسکو اور ہندوستان میں خاص فرق کیا ہے؟

9. ہندوستان کا ایک سیاسی نقشہ (ریاستوں کی حد بندی کے ساتھ) لیجیے اور ان جگہوں کی نشان دہی کیجیے:

(a) دو ایسی ریاستیں جہاں 67-1952 کے دوران کانگریس اقتدار میں نہیں تھی۔

(b) دو ایسی ریاستیں جہاں اس عرصہ میں کانگریس اقتدار میں رہی۔

10. درج ذیل اقتباس کو پڑھیے اور نیچے دیے گئے سوالوں کے جواب دیجیے:

"پٹیل، کانگریس کی تنظیمی شخصیت، کانگریس کو دوسرے سیاسی جتھوں سے پاک صاف کرنا چاہتے تھے اور کانگریس کو ایک مربوط اور قواعدو ضوابط کی پابند سیاسی پارٹی بنانا چاہتے تھے۔ وہ کانگریس کو سب کو گلے لگانے کے کردار سے دور کر کے ایک مضبوطی سے بُنے ہوئے اصول نظم وضبط کے پابند کارکنوں کی پارٹی بنانا چاہتے تھے۔ ایک حقیقت پسند ہونے کے ناطے وہ شمولیت سے زیادہ نظم وضبط پر توجہ دیتے تھے۔ گاندھی جی کا تحریک کے بارے میں جہاں ضرورت سے زیادہ رومانی نظریہ تھا وہاں پٹیل کا یہ تصور تھا کہ کانگریس ایک خالص سیاسی پارٹی ہو جس کا ایک نظریہ ہو اور ضابطوں کی پابند ہو، اس کم فہمی کی دلالت کرتی ہے کہ انھیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں کانگریس کو ایک حکومت کی حیثیت سے کتنا متنوع کردار ادا کرنا ہے۔" — رجنی کوٹھاری

(a) مصنف کا یہ خیال کیوں ہے کہ کانگریس کو ایک مربوط اور اصولوں پر عمل کرنے والی پارٹی نہیں ہونا چاہیے۔

(b) شروع کے سالوں میں کانگریس کے متنوع کردار کی کچھ مثالیں دیجیے۔

(c) مصنف یہ کیوں کہتا ہے کہ کانگریس کے مستقبل کے بارے میں گاندھی جی کا تصور رومانی تھا؟

آیئے اسے مل کر کریں

اپنی ریاست میں 1952 سے اور اس کے بعد الیکشن اور حکومتوں کا ایک معلوماتی نقشہ تیار کیجیے۔

اس نقشہ میں مندرجہ ذیل کالم ہونے چاہئیں: انتخابات کا سال، جیت حاصل کرنے والی پارٹی کا نام، حکمراں پارٹی یا پارٹیوں کے نام، وزیر اعلیٰ کے نام ۔

© NCERT not to be republished